پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

اِقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء

علامہ اقبال کی سرگزشتِ حیات کے مآخذ ان کی زندگی میں ماسوا ان کی شاعری (اردو، فارسی) اور خطبات (Reconstruction) اور کچھ علمی مضامین وتالیفات کے علاوہ بہت کم منظرِ عام پر آئے۔ ان کے خطوط کے مجموعے تو ان کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ منظرِ عام پر آنے لگے اور ان ذاتی ونجی تحریروں کی طباعت واشاعت کو بھی بعض لوگوں نے بڑے تردّد سے قبول کیا۔ اور ابھی اکثر خطوط یا بعض مجموعہ ہائے خطوط ایسے ہوں گے جو تا حال سامنے نہیں آسکے۔ انہی میں اقبال کے نام اکبرالہ آبادی کے خطوط کا مجموعہ بھی ہے جسے اقبال بقول خود حرزِ جاں بنا کر رکھتے تھے اور بانگِ درا کی اشاعتِ اوّل ۱۹۲۴ء کے بعد یہ مجموعہ بھی طباعت کے لیے تیار تھا۔ غالباً یہ مجموعہ دارالاشاعت لاہور کو دیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا چراغ حسن حسرت دارالاشاعت سے منسلک رہے اور اُن کے علم میں یہ مسوّدہ تھا۔ اقبال کی رحلت کے فوراً بعد اقبال پر حسرت کی تالیف منظرِ عام پر آئی اور اس میں اسی مجموعہ کے دو خطوط اقبال کے نام شامل ہیں اور مزید چند خطوط گورنمنٹ کالج کے مجلّہ ''راوی'' میں شائع ہوئے۔ مگر تا حال یہ مجموعہ نظروں سے اوجھل غالباً ''دارالاشاعت'' کے کسی گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوگا۔ یہ چند باتیں مَیں نے ابتدا میں بیان کردیں، کیونکہ ان کا تعلق بھی ہماری آج کی گفتگو سے ہے۔ نصف صدی پیشتر جب مجھے متذکرہ بالا موضوع پر سوچنے اور کام کرنے کا خیال آیا تھا تو اقبال کی یہی تحریریں اس کی محرک ہوئی تھی۔

اُس زمانے کے عام حالات میں طالب علموں کو اقبال کی شاعری ہی میں دلچسپی ہوتی تھی اور اُسی زمانے میں بعض ترقی پسند اقبال کی شاعری میں تضادات وغیرہ کے شوشے چھوڑ رہے تھے، اور بعض طالب علم ان کی

باتوں سے متاثر بھی ہوجاتے تھے۔اسرار ورموز کی تخلیق کے زمانے میں اقبال کومتصوّفین (خصوصاً حسن نظامی اور رفقا) کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا تو انہیں اپنے موقف کی وضاحت اور اپنی شاعری کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالنی پڑی۔اس طرح اقبال نے اپنے ذہنی وفکری ارتقا کی صورت گری کی راہ خود ہی واضح کردی تھی جس کی نشان دہی پر ہم اس موضوع کا احاطہ کرسکتے ہیں۔

یوں تو علامہ اقبال نے اپنے شعری مجموعوں میں زمانی ترتیب رکھ کر ارتقا کے اس عمل کی وضاحت بھی کردی ہے۔مثلاً ''بانگِ درا'' اردو کے شعری مجموعے کے تین ادوار خود انہوں نے قائم کردیئے۔اسی طرح اسرار ورموز کے بعد فارسی میں پیامِ مشرق، زبورِعجم، جاوید نامہ، مسافر، پس چہ باید کرد، ارمغانِ حجاز اور پھر اردو مجموعے بالِ جبریل، ضربِ کلیم، اس ترتیب سے آئے ہیں جو اقبال کے ذہنی وفکری ارتقا کے تسلسل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۱۹۲۰ء کے لگ بھگ زمانے میں علامہ اقبال پر ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ اپنی ذہنی سرگزشت لکھنے پر بھی آمادہ ہوئے تھے۔اس کا تذکرہ اُن خطوط میں ملتا ہے۔سید سلیمان ندوی کے نام ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

> ''.....اس کے علاوہ مَیں اپنے دل ودماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔''۱

(اقبال نامہ، حصہ اول صفحہ ۱۰۹)

اسی زمانے میں یہی بات اقبال نے وحید احمد مدیر ''نقیب'' (بدایوں) کے نام ایک خط میں ذرا ایک دوسرے انداز میں کہی ہے:

> ''میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے، جو اَوروں کے لیے سبق آموز ہوسکے۔ ہاں، خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہوسکتا ہے۔اگر کبھی فرصت ہوگئی تو لکھوں گا۔فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔''۲ (مکتوب محررہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء، اقبال نامہ، ص ۴۲۶)

پھر دو سال بعد انہی وحید احمد کو اقبال لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین (ہے کہ) بہت لوگوں کا فائدہ ہوگا۔''۳

(مکتوب محررہ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء، اقبال نامہ، ص ۱۷۶)

''یورپ کی آب وہَوا نے مجھے مسلمان کر دیا'' یہ جُملہ بڑا معنی خیز ہے۔ اقبال حصولِ علم کی خاطر ۱۹۰۵ء کے آخر میں یورپ گئے اور ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے۔ یورپ جانے سے قبل بھی وہ ماشاءاللہ مسلمان ہی تھے۔ پھر ان کے قلم سے یہ جُملہ کیوں نکلا! اور اِس جملے کی وضاحت میں انہوں نے اسے ''ایک طویل داستان'' کہہ دیا۔ اور اسے اپنے ''قلب کی سرگزشت'' بھی قرار دے دیا۔ دراصل یہی وہ ''سرگزشت'' ہے جسے وہ رسمی طور پر لکھ تو نہ سکے مگر اسی سرگزشت کا حاصل اقبال کے کلام و پیام میں پھیلا ہوا ہے، اور یہی وہ ذہنی وفکری سرگزشت ہے جو ہمارا آج کا موضوع ہے، اور جسے یورپ کے سہ سالہ قیام نے اقبال کے دل ودماغ میں بسیرا کر لیا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ اقبال کی شاعری کا آغاز بھی برصغیر کا مہتم بالشان واقعہ تھا۔ اقبال کا اُردو کلام جو ہمالیہ کی بلندیوں سے نازل ہوا، مرزا غالب سے سرگوشی کرتا، گوئٹے کو سلام کرتا اور ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کی سیر کرتا اور اس کے جواب کا عزم لیے مغرب کی رومانوی تحریک سے کندھا ملائے ۱۹۰۷ء میں ایک ایسے موڑ پر آ پہنچا جب دفعتاً انہوں نے شعروشاعری کے ترک کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ مُدیر ''مخزن'' شیخ عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں یوں رقم کیا ہے:

''ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمّم ہوگیا ہے کہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی مفید کام میں صرف کریں گے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ اُن کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب مُلک کے امراض کا علاج ہو سکے، اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترکِ شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب

سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ علمی دُنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہُوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں۔''۴

اقبال اور شیخ عبدالقادر کا دو سال تک لندن میں ساتھ رہا۔ انہی ایام میں عبداللہ مامون سہروردی اور مشیر حسین قدوائی نے وہاں اسلامک سوسائٹی قائم کی تھی۔ اقبال اس سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔ شیخ عبدالقادر (اور مشیر حسین قدوائی) نے اگست، ستمبر ۱۹۰۶ء میں استنبول، ترکی کی سیاحت کی اور مقامِ خلافت کی سیاحت کے بعد کچھ مضامین بھی لکھے۔ پان اسلامک سوسائٹی میں عالم اسلام کے احوال پر گفتگو بھی ہوئی ہوگی، جس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔

عالم اسلام پر یہ بڑا سخت وقت تھا۔ مغرب کی استعماری طاقتیں اسلامی ممالک کو اپنی نوآبادیات کے شکنجے میں جکڑ چکی تھیں۔ ایران کا بٹوارا، انگلستان اور روس کے مابین ہو چکا تھا۔ افغانستان اور مصر پر انگریز قابض تھے۔ شمالی افریقہ فرانس کے قبضے میں جا چکا تھا۔ ایک انحطاط پذیر عثمانی سلطنت تھی جو استعماری طاقتوں کی زد میں تھی اور جسے اہلِ مغرب مسئلہ شرق (Eastern Question) قرار دے کر اسے حل کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور اس مردِ بیمار کے دن گِن رہے تھے۔ یہی وہ صورت حال تھی جس نے اقبال کو ''یورپ کی آب وہَوا'' (یعنی اہلِ اسلام پر یورپ کی استعماری یورش) نے ''مسلمان کر دیا'' تھا۔

اس مختصر وقت میں اقبال کے اس ذہنی انقلاب کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ صرف اُن کی اس دَور کی ایک الہامی و کشفی غزل کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ بانگِ درا کے حصہ اوّل کی اس غزل پر اقبال نے خاص طور سے مارچ ۱۹۰۷ء کی تاریخ بھی درج کر دی ہے۔ اس غزل کا ہر شعر الہامی و کشفی ہے۔ صرف ایک دو شعر سنانے پر اکتفا کروں گا۔ اہل مغرب کو خطاب کرتا ہوئے کہا ہے:۵

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تُم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور آخری شعر میں اپنے عزم و ارادے کا اظہار ہے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

ایک عالمگیر ملّت کا تصّور جو اسلامی بھائی چارے، مساوات اور اخوت پر مبنی علاقائی وجغرافیائی خصوصیات، نسل، رنگ اور لسانی امتیازات سے ماورئ ہو (یعنی اسلامی اُمّہ) اسی لمحے اقبال کے ذہن میں ابھرا، اور یہ تصوّر ان کے یقین وایمان کی قیمتی متاع بن کر ان کے تخلیقی وجدان میں سما گیا۔ اسی زمانے کی ایک اور غزل میں اقبال نے عالمِ انسانی کے اس بھائی چارے کے تصوّر کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کیا ہے جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت کا لقب دے کر بھیجا:٦

﴿وما ارسلنک الا رحمة للعالمین﴾

اقبال، ایک آتشِ سوزاں کو دل میں سمیٹے جب واپس وطن آئے تو اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار ایک مختصر نظم ''عبدالقادر کے نام'' میں کیا جسے ''مخزن'' نومبر ۱۹۰۸ء میں شائع کرتے ہوئے یہ شذرہ شیخ عبدالقادر نے لکھا:

''اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے، اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ دل اپنے دلنواز کی محبت کا شکریہ ادا کرے اور مَیں یہ دُعا کروں کہ خدا حضرت اقبال کے ارادوں میں برکت دے اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، جواب اس خط کا مجھ سے بن پڑتا نہیں۔ خصوصاً جب جناب اقبال کے اشعار آبدار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی اور بے مائیگی پر نظر کرتا ہوں''۔

اس نظم کے یہ اشعار اقبال کے عزم صمیم اور پُختہ ارادے کے آئینہ دار ہیں:٧

اُٹھ کہ ظُلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کردیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

گول میز کانفرنس (۱۹۳۲ء) کے دوران کیمبرج کی ایک تقریب میں اقبال نے طلبہ اور اسکالروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مَیں اُن جوانوں کو جو اِس وقت کیمبرج میں تحصیل علم کررہے ہیں، چند مشورے دینا چاہوں گا۔ مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ الحاد اور مادہ پرستی کی رَو سے اپنے آپ کو بچایئے۔ یورپ سے بہت بڑی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے مذہب اور ریاست کو الگ الگ کردیا۔ اس لغزش نے اُن کے کلچر کو اخلاق روحانی سے محروم کرکے مادہ پرستی کی راہ پر ڈال دیا۔ مَیں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے، اس سے چھ سات سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ ۱۹۱۴ء کی یورپین جنگ عظیم متذکرہ بالا لغزش کا شاخسانہ تھی جو یورپین قوموں نے چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی سے کی تھی۔''۸

یورپ سے واپس آکر اقبال اپنے نئے پیشۂ وکالت میں مصروف رہے، گورنمنٹ کالج میں فلسفے کی کلاسوں کو بھی پڑھاتے رہے اور کچھ گھریلو مسائل کے علاوہ قومی مسائل پر بھی غور وفکر کرتے اور اپنے تاثرات لکھتے بھی رہے۔ ذہنی وفکری تاثرات کے سلسلے میں مس عطیہ کے نام اقبال کے خطوط اور Stray Reflections کے عنوان سے گاہے بگاہے لکھی گئی انگریزی یادداشتوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مؤخرالذکر ڈائری اپریل ۱۹۱۰ء سے شروع ہوکر چند ماہ تک وقفوں وقفوں سے لکھی جاتی رہی۔ اور اسی سال کے آخر میں علی گڑھ کالج میں اقبال کا وہ لیکچر ہوا جس کا عنوان تھا: "The Muslim Community: A Sociology Study" جس کا

مولانا ظفر علی خاں نے اردو میں ترجمہ ''ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کیا اور لاہور کے اجلاس میں اقبال کی موجودگی میں سنایا۔ اسی دوران اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا آغاز بھی ہوگیا تھا جس کا تذکرہ اقبال نے مس عطیہ کے نام مکتوب محررہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء میں کیا ہے: (ترجمہ)

''ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہو اور میں محروم تخیل کر دیا گیا ہوں..... شاید حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ پر جن کے مرقد منور کی مَیں نے حال میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے، میری آخری نظم ہوگی۔ مَیں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ نظم مجھ پر فرض ہے۔ اُمید ہے کہ ایک دفعہ یہ نظم مکمل ہوجائے تو آنے والے وقتوں میں عرصے تک زندہ رہے گی۔''۹

دراصل کسی نے ان کی شاعری کا نہ گلا گھونٹا تھا اور نہ ہی وہ مرحوم تخیّل ہوئے تھے۔ بلکہ اس وقفے کے دوران طرابلس اور بلقان کی محاربات نے اقبال کو جھنجوڑ دیا تھا، اور وہ اِن دلخراش حالات میں 'شکوہ اور جوابِ شکوہ'، 'حضورِ رسالت مآبؐ میں' اور 'شمع وشاعر' جیسی زندہ رہنے والی نظمیں لکھ رہے تھے۔ ''شمع'' (روشنی کی علامت) انہیں ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔ تاریکی میں روشنی کا جلوہ دکھا رہی تھی۔ ''شمع وشاعر'' اقبال کی ایک تاریخ ساز نظم ہے جو ملت کے تاریک حالات میں منظر عام پر آئی (۱۹۱۲ء انجمن حمایت اسلام میں پڑھی گئی) شمع کا یہ مشورہ ایک باطنی آواز تھی جو شاعر کے قلب و ذہن سے نکلی تھی: ۱۰

کہہ گئے ہیں شاعری جُزویست از پیغمبری

ہاں سُنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش!

شمع کی زبان سے یہ طنزیہ اشعار بھی شاعر کے احساس وفکر کے لیے تازیانے کا کام دے رہے تھے:

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہُوا برہم ترا!

بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

پُھول بے پروا ہیں، تُو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو

کارواں بے حِس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اقبال نے عطیہ کے مکتوب میں بیان کردہ اشعار پر مبنی متذکرہ بالا نظم چند برس کے دوران وقفوں وقفوں سے لکھی۔ ان کی شہرہ آفاق فارسی مثنوی ''اسرار و رموز'' جو آئندہ چند برسوں میں مکمل ہوئی اس الہامی کیفیت کا نتیجہ تھی جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی تُربت پر حاضری کے دوران ان پر طاری ہوئی۔ اقبال نے اس مثنوی میں اپنا بنیادی فلسفہ حیات اور مسلم قومیت کا نظریہ پیش کیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے سلسلے میں اس مثنوی کے تین ابیات یہاں پیش کی جاتی ہیں:۱۱

درمیانِ کار زارِ کفر و دیں

ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت

شمع دیں در محفل ما بر فروخت

در صفِ شاہنشہاں یکتا ستے

فقرِ او از تُربتش پیدا ستے

تمہیدی بند میں اقبال فرماتے ہیں:

نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن

بزم را از ہائے و ہُو آباد کُن

۱۹۱۵ء حیاتِ اقبال کا اہم سال تھا۔ اس دوران مثنوی اسرار خودی طباعت و اشاعت کے بعد بحث کا

موضوع بنی اور مباحث کا یہ سلسلہ چند سال تک سرگرم رہا۔ اقبال کو بھی موقف کا دفاع کرنا پڑا۔ کشن پرشاد شادؔ کے نام مکتوب محررہ ۱۴/ اپریل ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں: ''یہ مثنوی جس کا نام ''اسرارِ خودی'' ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے، مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، مَیں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اور مَیں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی۔ کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو، خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مُربّی تصور کرتا ہے۔ مگر

من نوائے شاعرِ فردا ستم

اور:

نا اُمید ستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مُردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ ۱۲

اقبال اور شاد کے مابین بحث کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے اور ان مکاتیب میں اقبال نے اپنی پوزیشن کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ اس سے ہم اقبال کے قلب و ذہن کی کیفیات کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مکتوب محررہ ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء میں اقبال رقمطراز ہیں:

''سرکار نے جو ارشاد فرمایا ہے، بالکل صحیح ہے یعنی اس بات کے ثبوت میں، مَیں نے مثنوی میں کچھ نہیں لکھا کہ جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ قوتِ حیات کو ضعیف و ناتواں کرنے والی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت دو طرح سے دیئے جا سکتے ہیں، فلسفیانہ اور شاعرانہ۔ مقدّم الذکر قسم کا ثبوت اس مثنوی میں کوئی نہیں، کیونکہ کتاب نظم ہے اور نظم میں فلسفیانہ ثبوت پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اگر یہی مضمون نثر میں لکھا جاتا تو وہ تمام ثبوت لکھے جاتے۔ شاعرانہ ثبوت منطقی اعتبار سے ضروری نہیں کہ صحیح ہوں، تاہم اس نکتہ خیال سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ مثنوی میں جا بجا موجود ہے۔ آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ مسئلہ نہایت دقیق اور گہرا ہے، اور چونکہ اس کا تعلق انسان کی موجودہ اور مابعد الموت کی زندگی سے ہے، اس واسطے ہر ایک آدمی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے۔ مَیں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ نتیجہ بیشتر اقوام مشرق کے موجودہ مذاق اور میلانِ طبیعت کے خلاف ہے۔ لیکن مشرق قدیم کے حکماء اس سے نا آشنا نہیں ہیں اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ مَیں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفۂ مغرب سے متاثر ہوا ہوں۔''[۱۳]

اب ہم اقبال کے حقیقی مآخذ اور مصدر کی طرف آتے ہیں۔ اقبال اپنے مشیرِ خاص مولانا غلام قادر گرامی کے نام مکتوب محررہ یکم جولائی ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں:

''آپ کی صحبت میں مثنوی کی تکمیل میں آسانی ہوگی۔ دوسرا حصّہ قریب الاختتام ہے۔ مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے۔ اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصہ کا مضمون ہوگا ''حیات مستقبلہ اسلامیہ'' یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے، اور جماعتِ اسلامیہ جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حادثات آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے، اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ مَیں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات و سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے، اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں۔ مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔ بہر حال مَیں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی، یا جب اس کا وقت آئے گا، اشاعت ہو جائے گی۔''[۱۴]

اقبال کے مطالعۂ قرآن شریف کا ذکر آیا تو اب ایک ثقہ راوی کی روایت بھی سن لیجیئے۔ اقبال کے صحبت نشین

کرنل فقیر سید وحیدالدین شعری القاء والہام کے سلسلے میں ایک مکالمے کی صورت میں بیان کرتے ہیں: ۱۵

ایک روز مَیں نے اقبال کو ہشاش بشاش اور گفتگو کے مُوڈ میں دیکھا۔ مَیں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور تخلیق شعر کے موضوع پر ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی اور پوچھا:

''ڈاکٹر صاحب! آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟''

انہوں نے فرمایا: ''ایک دفعہ مجھے فارمن کرسچین کالج لاہور کی سالانہ تقریب میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوقا نے مدعُو کیا۔ تقریب کے آخر میں چائے پیش کی گئی۔ ڈاکٹر لوقا نے مجھ سے کہا کہ چائے کے بعد آپ نہ جائیں، کیونکہ وہ ایک اہم معاملے پر مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ جب چائے کا دور ختم ہو گیا تو ڈاکٹر لوقا میرے پاس آئے اور مجھے ایک کونے میں لے گئے، اور پوچھا: ''اقبال! مجھے یہ بتایئے، کیا وہ قرآن کا مفہوم تھا جو آپ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر القا ہوا، اور چونکہ وہ عربی دان تھے، اس لیے انہوں نے اس مفہوم کو عربی زبان کے لبادے میں پیش کر دیا؟ یا وہ زبان تھی، جیسی کہ وہ قرآن میں ہے، اسی صورت میں ان پر نازل ہوئی؟''

مَیں نے کہا: ''قرآن کے الفاظ بھی جیسے کہ وہ ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے۔''

ڈاکٹر لوقا حیرت زدہ ہوئے اور کہنے لگے: ''اقبال! آپ ایک پڑھے لکھے اور مہذب انسان ہیں۔ کیا واقعی آپ کو یقین ہے کہ قرآن کی زبان بھی، جیسی کہ یہ ہمارے سامنے ہے، پیغمبر پر نازل ہوئی؟''

مَیں نے کہا: ''ڈاکٹر لوقا! میرے لیے یہ اعتقاد کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ذاتی تجربے کا معاملہ ہے۔ مَیں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ جب مَیں شعر لکھتا ہوں تو ایک ایک شعر مکمل الفاظ کے ساتھ مجھ پر وارد ہوتا ہے۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کی زبان کا نزول کیوں نہیں ہو سکتا؟''

یہ واقعہ یا قصہ بیان کرنے کے بعد اقبال نے مزید یہ فرمایا: ''جب مجھ پر شعری القا کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ایسے نظر آتا ہے جیسے ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال پھینکا ہو اور مچھلیاں جال میں اس کثرت سے کھچی چلی آتی ہیں کہ ماہی گیر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کونسی مچھلی پکڑوں اور کونسی چھوڑ

دوں؟''مَیں نے پوچھا:''کیا یہ کیفیت آپ پر ہمیشہ طاری ہوتی ہے؟؟'' اُنہوں نے کہا:''نہیں! ایسی کیفیت مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ طاری ہوتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ مگر جب یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو یہ گھنٹوں تک مسلسل جاری رہتی ہے، اور مَیں کسی قسم کی کاوش کے بغیر شعر لکھتا چلا جاتا ہوں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب کبھی لمبے وقفے کے بعد یہ مُوڈ دوبارہ طاری ہوتا ہے تو آخری شعر جو پہلے عرصے میں لکھا گیا ہو، بعد میں آنے والے کلام کے پہلے شعر سے معنوی لحاظ سے مربوط ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ان کیفیات میں ایک اندرونی ربط و تسلسل بھی قائم رہتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیفیات کے یہ مختلف لمحات ایک ہی زنجیر میں گُندھے ہوتے ہیں، اور جب شعری مُوڈ تمام ہوجاتا ہے تو مجھے ایک خاص قسم کی تھکن کا احساس ہوتا ہے اور اعصابی بے چینی اور دباؤ (Depression) بڑھ جاتا ہے۔''

اقبال رُک گئے۔ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ اچانک وہ دوبارہ بولے:''میں نے مشہور جرمن شاعر گوئیٹے کے بارے میں پڑھا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان کے ترجمے میں قرآن کا مطالعہ کیا تو اس نے اپنے ایک اپنے دوست سے کہا کہ''جب کبھی وہ اس کتاب کو پڑھتا ہے اس کی روح لرزہ براندم ہوجاتی ہے۔''

آپ دیکھئے، سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اقبال نے کہا''کہ شاعر بھی ایک قسم کے القا والہام کے نزول کے تجربے سے گزرتا ہے۔ اس لیے جب کبھی اس کا سابقہ کسی الہامی طور پر نازل شدہ کتابِ سے ہوتا ہے تو وہ اس کتاب کے اندرونی مطالب کو اپنی رُوح سے ہم آہنگ پاتا ہے اور ایک خاص قسم کے ترّفع کی کیفیت وہ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کا تجربہ کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔''۱۵

(''روزگارِ فقیر'')

کیمبرج کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Secrets of the Self) کے عنوان سے کیا، تو اقبال کی اس تصنیف کے خیالات مغربی دنیا میں بھی پہنچے اور کئی اسکالروں نے اقبال کی اس تالیف پر اپنے اپنے انداز میں تبصرے کیے۔ اقبال کو مسٹر ڈکنسن کا ریویو سب سے زیادہ دلچسپ نظر

آیا، جس پر نکلسن کے نام مکتوب (محرّرہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء) لکھتے ہوئے انہوں نے طویل تبصرہ کیا جس میں مسٹر ڈکنسن کی بعض غلط فہمیوں کو رفع کرتے اور اپنے فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے اپنا یہ اسلامی موقف واضح کیا:

''مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق وانطباق مخصوص ومحدود ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا یہ ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں ہمیشہ عالمگیر حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطبِ اولین نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب وتبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ اسلام ہمیشہ رنگ ونسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصبّ العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط تھا کہ سائنس اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ دراصل، اسلام بلکہ کل عالمِ انسانی کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس خوفناک اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ جب سے مَیں یہ دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا یہ عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں قبولیت حاصل کر رہا ہے، اس وقت سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اپنے عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک ووطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے مَیں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا اپنا فرضِ عین سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ کل بنی آدم کی نشو وارتقاء ہے۔

نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس بات کا شدت سے مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔ مجھے اسلام سے اس لیے بھی از بس اُنس ہے کہ یہی جماعت میرے مقاصد کے لیے موزوں واقع ہوئی ہے۔

مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی مغالطے سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کل انسانیت کے اتحادِ عمومی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے یہ کہتا ہے۔

﴿تعالو الیٰ کلمۃٍ سوآءِ بیننا و بینکُم﴾ (آل عمران:۶۴)

''(اے اہل کتاب) آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے''۱۶

اقبال کے ذہنی وفکری ارتقاء کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے شروع میں وہ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ سیاسی مفکر، مدبر اور پیام بر کے طور پر ایک مقصد اور پیام لے کر گامزنِ سفر ہوئے۔ اس لحاظ سے ۱۹۱۰ء ان کی زندگی کا اہم سنگ میل تھا، جب ان کے بنیادی فلسفے خودشناسی کا آغاز ہوا، اور اسرار خودی ورموز بے خودی کی صورت میں اس کی تکمیل ہوئی۔ بعد کی شعری تالیفات اسی اسرار ورموز کی توسیع شدہ صورتیں ہیں جن کی فہرست شروع میں پیش کی گئی۔ ''جاوید نامہ'' کے آخر میں انہوں نے نئی نسلوں کو ایک پیغام دیا ہے جس کی یہ کلید ہے:

آدمیت، احترامِ آدمی
با خبر شو از مقامِ آدمی

اور اب آخر میں ''ضربِ کلیم'' کی ایک مختصر سی نظم کے حوالے سے دورِ حاضر کے ایک الم انگیز واقعہ کا ذکر کر کے رخصت چاہوں گا۔

مَیں نے بھی بچپن میں ایک قصہ پڑھا تھا، اور آپ نے بھی پڑھا ہوگا۔ قصہ تھا ایک میمنے اور بھیڑیے کا۔ یہ تو ایک سبق آموز قصہ تھا۔ اب آپ اس قصے کا حقیقی روپ ملاحظہ فرمائیے۔

یہ واقعہ اگست ۱۹۳۵ء کا ہے۔ جب ''مہذب یورپ'' کا ایک بھیڑیا (اطالیہ) ایک معصوم بھیڑ یعنی میمنے (ابی سینیا۔ حبشہ) پہ جھپٹا تھا۔ مہذب یورپ کے ایک ملک کا، افریقہ کے ایک، غریب اور کمزور ملک پر یہ عریاں حملہ تھا۔ اقبال کا دل خون ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگے، اور ان آنسوؤں نے ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کو ایک مختصر نظم بعنوان ''ابی سینیا'' کی یہ شکل اختیار کر لی تھی:

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہر ناک ابی سینیا کی لاش

ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش!
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش!
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئنہ
روما نے کردیا سرِ بازار پاش پاش!
پیرکلیسا! یہ حقیقت ہے دلخراش!

اقبال تو یہ آنسو بہا کر تین سال بعد رحلت فرما گئے اور نام نہاد مہذب دنیا دوسری عالمگیر جنگ میں اُلجھ کر رہ گئی۔اقبال کی اس نظم کے دس برس بعد ابی سینیا کا ''ہیرو'' اپنے انجام کو پہنچ گیا اور اس کی لاش روما کی سڑکوں پر گھسیٹی گئی۔مگر ابلیسی طاقتوں نے اس سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔اور آج پھران کے ظلم وستم کے مناظر عراق، فلسطین، افغانستان، کشمیر، چیچنیا، دنیا میں ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں، اور نام نہاد جمعیت الاقوام (UNO) ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی مثال بن کر رہ گئی ہے۔مرگ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، معلوم نہیں کب خاک وخون میں لوٹتے ہوئے مظلوم بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کی کراہیں رنگ لائیں اور دورِ حاضر کے فرعون اور نمرود بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔

فاعتبرو یا اولی الابصار

حوالے اور حواشی

1 اقبالنامہ، حصہ اوّل، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، صفحہ ۱۰۹

2 ایضاً، صفحہ ۴۲۶

۳ انوار اقبال، مرتبہ، بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی صفحہ ۱۷۶

۴ بانگ درا۔ کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۴۳

۵ ایضاً، صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸

۶ ایضاً، صفحہ ۱۶۲

۷ ایضاً، صفحہ ۱۵۸

۸ گُفتار اقبال، مرّتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۲۵۴

۹ اقبال نامہ، حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، صفحہ ۱۴۶

۱۰ بانگ درا، کلیات اقبال اردو، صفحہ ۲۱۳، ۲۱۶

۱۱ کلیات فارسی، اقبال، صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

۱۲ اقبال بنام شاد، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۱۶۳، ۱۶۴

۱۳ ایضاً، صفحہ ۱۶۷

۱۴ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ اقبال اکادمی، کراچی، صفحہ ۱۲۴

۱۵ روزگار فقیر، سید وحیدالدین فقیر، مکتبہ تعمیر انسانیت، صفحہ ۳۸۔۴۰، ۱۹۶۵ء

۱۶ اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء، بزم اقبال (ترجمہ) صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲